منصبِ افتاء اور مفتی کی ذمہ داریاں

(آخری قسط)

تحریر : محمد المکی ناصری' ترجمہ : ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

منصب افتاء اور علماء کرام

اللہ رب العزت نے اپنی کتاب عزیز میں ارشاد فرمایا ہے :

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ﴾ (المجادلہ : ۱۱)

"تم میں سے جو ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اللہ ان کے درجات بلند کرے گا۔"

نیز فرمایا :

﴿ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّنْ نَّشَاءُ ' وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(یوسف : ۷۶)

"ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم والے کے اوپر اس سے بھی زیادہ علم والا ہے۔"

مختلف عصور و ممالک میں علماء کرام جن مختلف درجات پر فائز رہے ہیں ان کے اعتبار سے اسلام کی تاریخ افتاء مفتیوں کے کئی ایک نمونے پیش کرتی ہے اور اس کی وجہ مختلف ادوار میں فکر اسلامی میں انقلابات اور مد و جزر کا آنا ہے۔

پہلا نمونہ : فقیہ کا نمونہ ہے' ایک ایسا فقیہ جو اجتہاد کے تمام اوصاف و معاملات سے آگاہ اور واقف ہے' اللہ کی کتاب اور سنت رسول ﷺ کا عالم ہے۔ جو احکام میں اجتہاد مطلق کا امین ہے' اور اس کا اجتہاد شریعت کے عام و خاص' اجمالی و تفصیلی دلائل سے عبارت ہے۔ یہ ایک ایسا نمونہ ہے جسے مثالی اور درجہ اول کا نمونہ کہا جا سکتا ہے جو مجتہدین کو حاصل ہے' جیسے ائمہ مذاہب اور فقہی مذاہب کے بانی علماء کرام۔

دوسرا نمونہ : ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جو مشہور فقہی مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو اختیار کرتا ہے' پھر اپنے امام مذہب کی رائے کے مطابق ہی اجتہاد و فتویٰ کے راستہ پر گامزن ہے۔ اسے اس بات کا یقین کامل ہے کہ اس کے امام نے جو کچھ کہا وہ صحیح اور اس نے جو اصول و قواعد مرتب کئے وہ صحیح تر ہیں۔ اگر اس کے پاس بعض ایسے مسائل آجاتے ہیں جن میں اس کے امام کا کوئی قول یا رائے نہ ہو تو وہ از خود اس میں اجتہاد سے نہیں گھبراتا بلکہ قیاس کے ذریعے وہ اپنے امام کے اقوال کی روشنی میں نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے' کیونکہ اسے اپنے امام کا نقطہ نظر اور دلائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نمونہ دوسرے درجہ میں ہے اور یہ بھی مجتہدین کے درجہ میں ہے جو ایک مذہب کے پابند اور اس میں رہتے ہوئے اجتہاد کرتے ہیں۔

تیسرا نمونہ : یہ ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جو اپنے امام مذہب کے اقوال و فتاویٰ اور ان پر اس کے دلائل پر قائم ہے۔ وہ کسی مسئلہ میں اس سے اختلاف نہیں کرتا اور کسی بھی مسئلہ میں اگر اسے امام کی رائے مل جائے تو اسی کو ترجیح دیتا ہے اور از خود مسئلہ میں تحقیق کرنے کے چکر میں نہیں پڑتا بلکہ اسی پر اکتفا کرتا ہے اور اس کا متبادل تلاش نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ اپنے امام سے استنباط کردہ مسائل کو کافی سمجھتا ہے۔ یہ نمونہ تیسرے درجہ میں آتا ہے۔ یہ اجتہاد اور تقلید کا درمیانی درجہ ہے۔

چوتھا نمونہ : یہ ایسے فقیہ کا نمونہ ہے جسے متفقہ فی المذہب کہا جاتا ہے اور جو اپنے اوپر تقلید محض کو لازم کئے ہوئے ہے۔ وہ امام اور اس کے اصحاب کے اقوال و فتاویٰ پر انحصار کرتا ہے اور امام مذہب کے بیان کردہ مسائل کو اصول و فروع میں پیش کرتا ہے۔ جب کبھی اس سے کسی مسئلہ میں بات کی جائے اور اس کے سامنے کوئی دلیل پیش کی جائے تو وہ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ امام (فلاں) ہم سے زیادہ بہتر جانتے تھے اور ہم تو ان کی تقلید کرتے ہیں اور ان کے فیصلوں سے تجاوز نہیں کرتے۔ یہ نمونہ چوتھے اور آخری درجہ میں ہے۔ {۵۷}

اس تجزیہ سے ثابت ہوا کہ مفتی مقلد جو محض تقلید محض پر قائم ہو وہ دراصل حقیقی مفتیوں میں سے نہیں بلکہ وہ ان کا قائم مقام ہے اور ان کی نیابت کا فریضہ انجام دینے کی وجہ سے مفتیوں میں شمار ہے۔ درحقیقت وہ اپنے امام اور مفتیوں کے درمیان ایک

واسطہ ہے۔ ابن القیم کہتے ہیں : "ان کے علاوہ اگر کوئی فقیہ ہے تو وہ ایک تھرڈ کلاس خود ساختہ مفتی ہے جس نے اپنے آپ کو کام کے بندوں سے دور رکھا اور علماء کے درجہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایسا شخص جاہلوں میں سے ایک ہے"۔

مفتی مقلّد کس مذہب پر فتویٰ دے

مذہبی امور پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ متفق علیہ یا مختلف فیہ مذہبی مسائل جو مدون یا مرتب ہو چکے ہیں' حکم کے اعتبار سے پانچ طرح کے ہیں :

۱۔ ایسے مسائل جن میں اثبات حکم پر اتفاق ہے۔

۲۔ ایسے مسائل جن میں اکثر کے حکم کا اثبات اور کم کی نفی ہے' اور وہ مذہب مشہور کہلاتا ہے۔ پھر جس میں دلیل قوی ہو وہ راجح قرار پاتا ہے۔

۳۔ ایسے مسائل' جن میں اثبات اور نفی کے دو قول ہوں اور برابر حیثیت کے ہوں۔

۴۔ ایسے مسائل جن میں اثبات کا حکم کم اور نفی کا اکثر ہو۔ ایسے مسائل کو مرجوع کہتے ہیں جو راجح اور مشہور کے مقابل ہے۔

۵۔ ایسے مسائل جن میں ایک یا دو نے اثبات کا حکم لگایا ہو اور باقیوں نے نفی کا' اسے شاذ کہتے ہیں۔

ان پانچ اقسام میں سے معاملات اور حقوق العباد میں فتویٰ دینا جائز ہے بشرطیکہ قول متفق علیہ' قول مشہور یا راجح ہر طرح سے برابر نوعیت کے ہوں اور ان میں ترجیح ممکن نہ ہو تو دو قولوں میں سے کسی ایک کے مطابق فتویٰ دیا جا سکتا ہے اور مرجوع قول پر صرف کسی ضرورت یا مصلحت کی بناء پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے یا کسی امام کے کسی قول کی پہلے سے قائم ترجیح کے مطابق فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔

قول شاذ پر فتویٰ نہیں دیا جا سکتا' اور اگر کوئی قول شاذ پر فتویٰ دے تو اس سے باز پرس کی جائے گی الا یہ کہ عدلیہ کے قاضی حضرات اور مفتی کے منصب پر فائز اہل علم اس بات کی تصدیق کریں کہ قول شاذ پر دیا گیا فتویٰ مخصوصہ قابل عمل ہے۔ ایسی صورت میں یہ فتویٰ قول مشہور سے بھی مقدم ہو گا باوجودیکہ بنیادی طور پر وہ قول شاذ پر ہے۔ شرط یہ

ہے کہ تصدیق کنندگان ایسے عادل اور ثقہ اہل علم ہوں جن کی فقہی امور میں پیروی کی جاتی ہو اور جنہیں فقہی معاملات کا خاصا تجربہ ہو۔ جب کبھی بھی قول شاذ پر دیئے گئے فتویٰ کو ناقابل عمل یا منسوخ قرار دیا جائے گا تو خود بخود اس کے تمام دلائل بھی ناقابل عمل ہوں گے اور لائق اعتبار نہ رہیں گے اور قول مشہور کی طرف از سرنو رجوع کرنا ہو گا۔ {۵۸}

التسولی نے القرافی کا ایک قول بیان کیا ہے کہ مجتہد کو قول راجح کے سوا فتویٰ دینا جائز نہیں جبکہ مقلد کے لئے جائز ہو گا کہ وہ اپنے مذہب میں قول مشہور پر فتویٰ دے اگرچہ وہ قول خود اس کی نظر میں راجح نہ ہو' یہ اسے لئے کہ اس پر اپنے امام کی پیروی لازمی ہے۔ البتہ ابن القیم کا خیال یہ ہے کہ مفتی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے اعتقاد اور یقین کے خلاف فتویٰ دے' البتہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے قول راجح ہی کو بیان کرے کیونکہ اس پر عمل کرنا ہی اولیٰ اور افضل ہے۔ {۵۹} امام الجوینی نے کہا ہے کہ کسی مفتی کو اپنے امام مذہب کے قول کے بغیر فتویٰ دینا جائز نہیں' ہاں مگر یہ کہ وہ کسی دوسرے مذہب میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہو اور اس کے تمام اسرار و رموز سے واقف و آگاہ ہو۔ {۶۰}

اگر کسی مفتی نے فتویٰ دیا اور فتویٰ صادر ہو جانے کے بعد اس پر واضح ہوا کہ یہ اس کے امام مذہب کی نصوص کے خلاف ہے تو مقلد ہونے کی صورت میں اسے فوراً اس سے رجوع کر لینا چاہئے کیونکہ اس کے امام مذہب کی بات اور دلیل اس کے لئے وہی حکم رکھتی ہے جو کسی مجتہد بالذات کے لئے نص شارع۔ {۶۱} ہاں اگر اس پر واضح ہو جائے کہ اس کے امام کی رائے مخالف نص اور اجماع ہے یا قیاس جلی کے خلاف ہے تو ایسی صورت میں امام کی رائے پر فتویٰ دینا حرام ہے اور اس سے اس کے امام کی شان میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوتی' کیونکہ اجتہاد میں خطا واقع ہونے سے گناہ لازم نہیں آتا' جیسا کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے "حاکم اگر اجتہاد کرے اور اس میں غلطی کر بیٹھے تب بھی اسے ایک اجر ملتا ہے اور اگر وہ اجتہاد کرے اور صحیح حل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے"۔ {۶۲}

تاہم ایسی معمولی باتیں جن کے بارے میں مذہب (مخصوص) میں کوئی نص نہ ہو تو ان

میں پہلی بار ہی تحقیق کرنا ہوگی اور مفتی کے لئے امام یا اس کے اصحاب کے اقوال منصوصہ سے ہٹ کر بحث و تحقیق اور تخریج جائز ہوگی جبکہ اسے اپنے امام مذہب کے قواعد و ضوابط کا علم ہو اور وہ ان تمام دلائل و قیاسات سے واقف ہو جن سے امام مذہب نے کام لیا ہے' اور اگر اس میں یہ استعداد نہ ہو تو پھر بلاوجہ وہ اس بکھیڑے میں نہ پڑے جس کا وہ اہل نہیں۔ القرافی کہتے ہیں "مفتی کو چاہئے کہ اگر اس کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آجائے جس کے بارے میں نص نہ ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اجماع کے قواعد پر غور و فکر کر کے دیکھے کہ اس کی جو صورت نکلتی ہوئی نظر آتی ہے اس میں اور اصل میں کیا فرق ہے؟ اگر اسے معلوم ہو کہ اصل اور صورت مخرجہ میں بہت زیادہ فرق واقع ہو رہا ہے تو تخریج مسئلہ سے اجتناب کرے کیونکہ قیاس مع الفارق باطل ہے۔ جس طرح کسی مجتہد کے لئے قواعد شرع پر قیاس مع الفارق ممنوع ہے اسی طرح کسی مقلد کا قیاس مع الفارق درست نہیں۔ چنانچہ کسی مفتی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی غیر منصوص کو منصوص پر مقدم جانے یا ترجیح دے ماسوائے اس صورت کے کہ اسے اپنے مذہب کے قواعد اور اجماع کے ضوابط پر کامل دسترس ہو۔ {۶۳} مفتی کے ان امور میں ضعف کے باعث اسے تخریج سے منع کیا جائے۔ مفتی کے لئے ممکن ہے کہ اگر وہ تخریج و ترجیح کا اہل ہو تو وہ ان ائمہ کے ذاتی اوصاف میں غور کر کے یہ نتیجہ نکالے کہ ان میں کس کی رائے قابل ترجیح ہو سکتی ہے۔ پھر ان میں سے بڑے عالم' متقی اور عمر رسیدہ کی رائے کو ترجیح دے اور اگر تمام ایک دوسرے سے بعض اوصاف کے اعتبار سے ممتاز ہوں تو پھر ترجیح اس کو دے جو زیادہ صائب الرائے ہو۔ ایسا بڑا عالم مقدم ہوگا جو متقی بھی زیادہ ہو بہ نسبت اس زیادہ متقی کے جو بڑا عالم نہ ہو۔ ترجیح کا یہ اصول اسی طرح ہے جس طرح احادیث میں راویوں کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں اس وقت کیا جاتا ہے جب تعارض روایات پیش آئے۔ {۶۴}

مفتی مقلد اپنے مذہب کی کن کتب پر اعتماد کرے

مفتی کو چاہئے کہ وہ ایسی کتابوں سے فتویٰ نہ دے جو غیر مشہور و گمنام ہوں یا جن کے مندرجات کی صحت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اسی طرح ایسی نئی کتابیں جن میں منقول عبارات کا

کتب معتبرہ سے منقول ہونا ثابت نہ ہو' یا جن کے مصنفین کی عدالت و ثقاہت کا یقین نہ ہو۔ اسی طرح اگر نفس حکم ان کتب کے حواشی یا تعلیقات سے ثابت ہو اور وہ بھی نامعلوم اصل سے منقول ہوں اور امہات الکتب میں وہ حکم نہ پایا جائے نہ ان کے حوالہ جات مذکور ہوں نہ وہ واضح خط سے تحریر کردہ ہوں تو ایسی عبارات سے فتاوی میں استدلال درست نہیں۔

تاہم ایسی کتب مشہورہ جو علماء کے ہاں معروف ہیں اور جن کے بارے میں علماء کی تصدیق موجود ہو کہ ان میں کوئی تحریف یا ردوبدل نہیں ہوا ہے تو ایسی کتب سے فتویٰ دینا جائز ہے اگرچہ اصول تو یہ ہے کہ فتویٰ ایسی کتب سے دیا جائے جن کو ثقہ اور عادل علماء نے روایت کیا ہو اور ان سے مجتہد نے اکتساب کیا ہو جس کا یہ مفتی مقلد ہے تاکہ اس کے لئے ان کتب کی صحت ایسی بے غبار ہو جائے جیسے مجتہد کے لئے احادیث کی۔ کیونکہ ہر دو صورتوں میں اللہ کے دین کو نقل کرنا مقصود ہے' مگر لوگوں نے اس معاملہ میں وسعت پیدا کرلی ہے اور متقدین کی ایسی کتب مشہورہ سے اخذ کو جائز قرار دیا ہے جن میں رواۃ کا سلسلہ اگرچہ مذکور نہ ہو۔ جیسا کہ نحو اور عربی زبان کی کتابوں میں سند اور رواۃ کا سلسلہ متروک ہو چکا حالانکہ عربی کی کتابیں ہی کتاب و سنت کی اساس ہیں۔ اسی طرح فقہ کی کتابوں میں بھی سلسلہ رواۃ کا ذکر اب غیر ضروری سمجھ کر ترک کردیا گیا ہے کیونکہ یہ اطمینان ہو چکا کہ ان میں کوئی تحریف ہوئی ہے اور نہ ردوبدل۔ {۶۵}

علامہ عزالدین ابن عبد السلام سے مفتی مقلد کے بارے میں پوچھا گیا جو ایسے قول سے فتویٰ دیتا ہو جس کی نسبت اس کے امام مذہب کی طرف ہے اور اس مفتی نے روایت کے اصولوں کے مطابق یہ قول اپنے امام مذہب سے نہیں لیا بلکہ صرف امام مذہب کی کتب کے مطالعہ سے حاصل کیا ہے تو کیا یہ ایسے قول کو فتویٰ میں پیش کرسکتا ہے؟ اس کے جواب میں علامہ نے کہا: فقہ کی صحیح کتب پر اعتماد کرنا جن کی توثیق ہو چکی' علماء عصر کے ہاں متفق علیہ ہے کیونکہ ان کتابوں کو ایسی ہی ثقاہت حاصل ہو چکی ہے جیسی سند و روایت کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں نے نحو' لغت' طب اور دیگر تمام علوم کی مشہور کتابوں پر اعتماد کیا ہے کیونکہ انہیں بھی ثقاہت و اعتماد کی سند مل چکی اور ان میں ردوبدل کا خدشہ بعید از

قیاس قرار پاچکا۔ اب جو کوئی یہ سمجھے کہ لوگوں نے ان کتابوں پر اعتماد کر کے غلطی کی ہے تو وہ خود غلطی پر ہے کیونکہ اگر اس اعتماد کا جواز نہ ہو تو بہت سے معاملات جن کا تعلق طب' نحو اور عربی زبان کے حوالہ سے شریعت سے ہے وہ سب معطل ہو کر رہ جائیں۔ شریعت بہت سی صورتوں میں اطباء کے اقوال سے رجوع کرتی ہے جبکہ طب کی زیادہ تر کتابوں کا تعلق قوم کفار سے ہے لیکن جب ان کتابوں میں وضع و تدلیس کا امکان نہیں اور ان پر اعتماد ہو چکا جیسا کہ اشعار میں' کہ عرب کے کافر شعراء کے کلام پر اعتماد کیا گیا' اسی طرح ان پر بھی اعتماد کا معاملہ ہے۔ {۶۶}

الزرکشی نے ابو اسحاق اسفرائنی سے نقل کیا ہے {۶۷} کہ انہوں نے معتمد کتابوں سے نقل کرنے کے جواز پر اجماع بیان کیا ہے اور اس میں مولف تک اتصال سند کی شرط بھی عائد نہیں کی۔ ابن الصلاح نے کہا ہے کہ اگر کسی کتاب کے کسی نسخہ کی صحت کا یقین ہو تو یوں کہنا چاہئے "فلاں نے یوں کہا ہے" ورنہ کسی کے قول کو یونہی لفظ یقین کے ساتھ بیان نہ کرنا چاہئے۔ امام سیوطی نے اس کی تاکید کرتے ہوئے کہا ہے "آج کل لوگ کتب سے نقل کرتے ہیں اور منقولہ عبارات کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف ظاہر کرتے ہیں۔" {۶۸}

اس طرح کسی بھی فقہی مذہب کی کتب معتمدہ سے فتویٰ دینے کے جواز پر اتفاق ہے اگرچہ براہ راست ان کے مصنفین سے روایت نہ بھی لی گئی ہو۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام' شہاب الدین القرافی' برہان الدین ابن فرحون' بدرالدین الزرکشی' جلال الدین السیوطی اور ابو اسحاق اسفرائنی نے اس پر اجماع بیان کیا ہے۔

عامی کا عامی کو فتویٰ دینا

کیا کسی عام آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی عام آدمی کو ان معلومات کی بناء فتویٰ دے دے جو اس نے علماء سے سنی یا حاصل کی ہوں؟ یہ سوال ایک سے زائد علماء اور کبار فقہاء نے چند مسائل کے حل کے سلسلہ میں اٹھایا ہے اور اس کے جواب میں جو اقوال سامنے آئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

پہلا قول : یہ مکمل ممانعت کا قول ہے۔ صاحب "الحاوی" کی رائے میں یہی صحیح تر ہے' کیونکہ عام آدمی میں استدلال کی صلاحیت نہیں ہوتی اور نہ اسے شرائط استدلال کا علم ہوتا ہے اور وہ کسی ایسی بات کو دلیل خیال کرتا ہے جو کہ دراصل دلیل نہیں ہوتی۔

دوسرا قول : یہ جواز کا قول ہے' بشرطیکہ مسئلہ کی دلیل قرآن وسنت سے ہو' اور اگر ان دونوں کے علاوہ دلیل ہو تو جائز نہیں کیونکہ کتاب وسنت کے مخاطب تو سبھی لوگ ہیں۔ تو جس طرح ایک شخص پر لازم ہے کہ اسے کتاب وسنت کا جو حکم پہنچا ہو وہ اس پر عمل کرے اسی طرح کسی دوسرے کو قرآن وسنت سے رہنمائی فراہم کرنا اور اس سے آگاہ کرنا بھی اس کے لئے جائز ہے۔

قول ثالث : یہ جواز مطلق کا ہے' کیونکہ عام آدمی کے پاس بھی علم اس واقعہ کی دلیل کے ساتھ اس طرح پہنچا ہے جس طرح کہ ایک عالم کے پاس' اگر کوئی عالم اس وجہ سے ممتاز ہے کہ اس کے پاس علمی مہارت وملکہ ہے جس کی بناء پر وہ کسی دلیل پر قائم رہتا اور دلیل مخالف کو رد کر سکتا ہے تو عامی آدمی کے پاس بھی تو دلیل اور علم ہی ہے۔ اس کی تائید میں ابن القیم کہتے ہیں : "یہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے پیغام پہنچانے کا سلسلہ ہے۔ پس جو کوئی بھی یہ کام کر کے اسلام کا مددگار بنے اللہ اس کو جزائے خیر دے' اگرچہ ایک کلمہ خیر ہی کی تبلیغ کیوں نہ ہو"۔ انہوں نے اس مسئلہ میں اپنی تعلیق ان الفاظ پر ختم کی ہے "کسی عام آدمی کو ایسا شرعی مسئلہ بتانے سے روکنا جو وہ جانتا ہے' خطائے محض ہے۔ اللہ توفیق بخشے"{۶۹}

مفتی کی ادبی اور مادی ذمہ داریاں

مفتی کی اخلاقی اور ادبی ذمہ داری سے کسی کو اختلاف نہیں کیونکہ فتویٰ دراصل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تبلیغ پیغام ہے۔ اس سلسلہ میں مفتی کی ذمہ داری انتہائی اہم ہے' کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بولتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ نے یوں حکم دیا ہے یا اس طرح منع کیا ہے' یا اللہ نے یوں واجب قرار دیا ہے اور یوں حرام ٹھہرایا ہے{۷۰} اسی بنیاد پر ابن القیم نے اپنی معروف کتاب فتویٰ وقضاء کا

نام "اعلام الموقعین عن ربّ العالمین" رکھا ہے۔

ادبی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ مادی ذمہ داری بھی مفتی پر عائد ہوتی ہے اور وہ یوں کہ امام یا حاکم مفتی سے کوئی فتویٰ لے کر اس کے مطابق کوئی حکم نافذ کرتا ہے اور اگر بعد میں یہ معلوم ہو کہ مفتی سے فتویٰ میں سہو ہو گیا تو اس صورت میں اس فتویٰ پر عمل کے نتیجہ میں اگر کوئی مالی نقصان ہو تو مفتی اس کا ضامن ہو گا۔ اور اگر فتویٰ حکم حاکم یا امام کی بناء پر نہ دیا گیا ہو اور اس سے کوئی مالی یا جانی نقصان ہو جائے تو پھر دیکھا یہ جائے گا کہ فتویٰ دینے والا مفتی' فتویٰ دینے کا مجاز تھا یا نہیں؟ اگر وہ مجاز اور اہل تھا تو اس صورت میں ضمان مستفتی (سائل) پر ہے کیونکہ اسے اختیار تھا کہ وہ مفتی کے فتویٰ پر عمل کرے یا نہ کرے' وہ مفتی کے فتویٰ پر عمل پیرا ہونے کا پابند نہ تھا' اور اگر مفتی غیر مجاز اور نااہل تھا تو ضمان اسی پر ہو گی نہ کہ مستفتی پر۔ یہ مسئلہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں ہے کہ "جو کوئی علم طب نہ جانتا ہو اور طبیب بن بیٹھے تو وہ کسی بھی نقصان کا ذمہ دار (ضامن) ہو گا"{۷۱} یہ حدیث سنن ابو داؤد' سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں موجود ہے۔

ابراہیم اللقانی کی کتاب اصول فتویٰ میں "ضمان المفتی" کے عنوان سے لکھا ہے :

"ہمارے علماء نے کہا ہے کہ اگر مفتی کے فتویٰ سے کسی کا مال تلف ہو گیا اور مفتی مجتہد تھا تو اس پر کوئی ذمہ نہیں اور اگر مجتہد نہ تھا تو وہ نقصان کا ضامن ہے۔"

المازری نے کہا ہے کہ مفتی کے فتویٰ سے (جبکہ وہ مجتہد نہ ہو) اگر کوئی نقصان ہو جائے تو حاکم کو چاہئے کہ وہ اس کو تنبیہ کرے اور وہ نقصان کا ضامن بھی ہو گا' پھر اگر تنبیہ کے بعد وہ اہلیت فتویٰ حاصل کر لے تو اسے سزا نہ دی جائے اور اگر وہ پھر بھی اہلیت حاصل نہ کرے تو اسے فتویٰ دینے سے منع کر دیا جائے۔{۷۲}

عرض مترجم

علامہ محمد مکی الناصری کی اس تحریر سے یہ بات واضح ہو چکی کہ فتویٰ نویسی پر کہ وہ کا کام نہیں بلکہ یہ انتہائی ذمہ دارانہ منصب ہے' مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے ملک میں نہ تو مفتی کی اہلیت سے متعلق کوئی جانتا ہے نہ اس منصب کی نزاکت سے کوئی واقف و آگاہ

ہے بلکہ جس کا جی چاہے مفتی ہونے کا اعلان کردے اور راتوں رات مفتی بن بیٹھے۔ علماء کرام بالخصوص اہل علم و دانش کو چاہئے کہ وہ کوئی ایسا نظام قائم کریں جس کے تحت مفتی کا منصب صرف قابل اور اہل لوگوں ہی کے لئے مختص ہو سکے اور ملک میں خود ساختہ مفتیوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی مسلکی انارکی کا خاتمہ ممکن ہو۔

حواشی

{۵۷} ابن القیم' اعلام الموقعین' ج ۴' ص ۱۸۴' ۱۸۵' ۱۸۶' ۱۸۷ و ابن رشد' المختصر ج ۲' ص ۹۴

{۵۸} التسولی علی التحفہ' ج ۱' ص ۲۵

{۵۹} ابن القیم' الاعلام' ج ۴' ص ۱۵۴

{۶۰} ایضاً۔ ج ۴' ص ۱۷۰

{۶۱} النووی' المجموع' ج ۱' ص ۴۵

{۶۲} الفروق' ج ۲' ص ۱۰۹' للقرافی

{۶۳} القرافی' الاحکام' ص ۲۶۰' والفروق ج ۲' ص ۱۷۰

{۶۴} ابن الصلاح بحوالہ ابن فرحون' التبصرہ ج ۱' ص ۵۰' ۵۱

{۶۵} القرافی' الاحکام فی تمیز الفتاوی عن الاحکام' ص ۲۶۱' ۲۶۲

{۶۶} ابن فرحون' التبصرہ' ج ۱' ص ۵۳۔ ۵۴۔ السیوطی' الاشباہ والنظائر' ص ۲۴۷

{۶۷} السیوطی' الاشباہ والنظائر' ص ۳۴۶

{۶۸} ایضاً

{۶۹} النووی' المجموع' ج ۱' ص ۴۵۔ ابن القیم' الاعلام' ج ۴' ص ۱۷۳۔ ۱۸۸

{۷۰} الاعلام' لابن القیم' ج ۱' ص ۱۶۴

{۷۱} ایضاً ——— ج ۴' ص ۱۹۶۔ ۱۹۷

{۷۲} ایضاً ——— ج ۴' ص ۱۹۷